لگی پہلے منی نے ایک کمرے کا دروازہ اندر دھکیلا، آہستہ آہستہ اندر جھانکا اور پھر دبے پاؤں قالین پر چلنے لگی۔ یہ کوٹھی کسی ترنگ کی تھی اور کمروں میں قالین، فرنیچر، قیمتی ساز و سامان بافراط تھا۔ ایک لوہے کی پیٹی میں سے ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کے روپے بھی نکلے۔ لمبی الماریوں میں شنیل اور جارجٹ کے تھان، اور بستروں کی پیٹی میں سے، مخمل کھیس اور موتی چور کی رضائیاں نئی جگ مگ جگ مگ کرتی نکلیں۔۔ ہر کمرے میں سیلنگ فین اور قد آدم آئینہ تھا۔ ڈرائینگ روم میں باقی ساز و سامان کے علاوہ ایک بڑا سا پیانو بھی تھا جو عرفانی صاحب کی منی کو سب سے زیادہ پسند آیا۔۔ اتنے سارے ساز و سامان کے سامنے وہ لاش جو غسل خانے کے ٹب میں پڑی تھی کچھ زیادہ ہیبت ناک نہ لگی۔ لاش کا حلیہ اتنا مسخ ہو چکا تھا کہ اباجی اندازہ نہ لگا سکے کہ اسے ٹب میں ڈالنے سے پہلے بازو اور ٹانگیں علیحدہ کی گئی تھیں کہ اتنا عرصہ ٹب میں پڑے رہنے کے باعث آپنی تن سے جدا ہو گئیں۔۔ اس متعفن لاش کو اباجی نے بالکل تنِ تنہا رات کے وقت اسی گھر کے پچھواڑے اور کسی سے ٹیوب ویل کے پچھواڑے دفن کر دیا۔ سارے گھر میں وہ اذانیں دیتے پھرے۔ غسل خانے میں اگربتیاں جلائی گئیں۔۔۔ اور منی اور بجو کو حکم ہوا کہ وہ اکیلی کسی کمرے میں نہ جائیں۔۔۔۔

بٹالے میں اباجی کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی جس پر سریا، پتیل، برنجیاں کوکے وغیرہ بکتے تھے۔ اس دوکان کی دیکھ ریکھ کچھ ایسی تھی کہ بدنصیبی سے وہ ہی تجارت کے اصولوں سے واقف نہ تھے۔۔ گذارہ تو ہوتا تھا لیکن پس انداز ایک دھیلا بھر کی رقم نہ ہوتی۔۔ پاکستان پہنچ کر یہ چھ کنال کی کوٹھی تو جیسے کھل سم سم کے مترادف تھی۔ غار کا منہ کھلا اور

دولت اور افراط کے انبار لگ گئے۔۔

شاید اگر ڈمپل کی ماں کو اس رات سردی نہ لگ جاتی تو وہ اتنے بہت کچھ میں سے تینوں لڑکیوں کے جہیز چھپا کر رکھ لیتیں۔ لیکن اُن کے پھیپھڑوں میں سے تو پھٹے بانس کی سی صدائیں آنے لگیں۔۔ سپارہ کے ساتھ پلنگ پر لیٹی سارا سامان تکا کرتیں۔ اس گھر میں داخل ہونے کے ایک ہفتہ بعد منی کو سکول میں ڈال دیا گیا۔ وہ تانگہ پر باقی لڑکیوں کے ساتھ جانے لگی۔ چھوٹا سا بستہ کندھے پر لٹکائے جب وہ اپنی سہیلی کے ساتھ گھر واپس آتی تو اباجی بہت خوش ہوتے۔ منی کے گالوں پر دونوں جانب ہر وقت گڑھے دیکھ کر پڑوسیوں نے اس کا نام ڈمپل رکھ دیا تھا۔

ساتھ والے مکان میں ایک عیسائی گھرانہ رہتا تھا۔ ان کی میم صاحب رنگدار ہاؤس کوٹ پہنے لان کو پانی کی نالی سے سینچا کرتی تھی۔۔ پاپا جو مال روڈ پر سازوں کی ایک دوکان کے منیجر تھے بوسیدہ سوٹ اور سر پر فلٹ ہیٹ پہنتے تھے۔ ان کا کھانا دیسی اور زبان بدیسی تھی۔ تین لڑکے تھے اور تینوں مکینک تھے۔ اباجی کے خاندان سے ان کی صاحب سلامت باڑھ کے پاس آکر ایک دوسرے سے چند رسمی باتیں کرنے تک محدود تھی۔ ان ہی ملاقاتوں کے دوران پاپا نے ایک دن منی کو ڈمپل کہہ کر پکارا تھا۔ اور یہ نام اباجی کو اسقدر اچھا لگا تھا کہ شکیلہ جو اب تک منی تھی مستقل طور پر ڈمپل ہو گئی۔

یہ گھر آسیب زدہ تھا کہ نہیں۔ اتنی بات ضرور ہوئی کہ ابھی سپارہ چھ ماہ کی ہوئی تھی کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ جس رات امی فوت ہوئیں اس روز دن کے وقت خونی آندھی

چلی۔ کمروں میں مٹی گھس آئی۔ روشندان کھڑکیوں پر گلابی مائل زرد مٹی ہوا کے دوش پر چڑھی آ آ کر ٹکرانے لگی۔ . . . . سارا دن آندھی چلتی رہی اور شام کو اندر باہر فرشوں پر مٹی یوں پھیل گئی جیسے سمندر کے کنارے موج در موج ریت پڑی ہو۔ گرمیوں کی اس رات کو کہتے ہیں کہ ٹیوب ویل کے عقب میں پھر محلّہ والوں نے آگ جلتی دیکھی۔ . . . پاپا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر صبح آباجی کو بتایا کہ رات ٹیوب ویل کے پاس آگ جلتی رہی اور کسی کی ارتھی گھی سے تر لکڑیوں میں جھلستی رہی۔

امّی کے مرنے کے بعد آباجی کے ذمّے دو کام آن پڑے۔ برانڈرتھ روڈ پر جو چھوٹی سی دوکان انہوں نے لوہے کے سامان کی بنا رکھی تھی اس کی دیکھ بھال اور تینوں لڑکیوں کی دیکھ بھال۔ ان ہی دنوں گھر کے تمام قالین بک گئے۔ اور کوٹھی کے اوپر والا حصہ کرایہ پر چڑھ گیا۔ ان دونوں کاموں میں سے ایک بھی بھلے طور پر انجام نہ پا سکا۔ گھر کا سارا قیمتی سامان بھی بک گیا۔ اور لڑکیاں بھی اپنے اپنے رنگ کی نکل آئیں۔

ڈمپلے نے بڑے قیمتی سامان میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ ایک ایسے چھ کنال کے بنگلے میں پلی تھی جس میں ایک پاؤ گوشت دو وقت چلتا تھا۔ لیکن جو پروفیسر اعجاز حسین اس کی گھریلو زندگی دیکھ لیتے تو کہتے کہ وہ "سپلٹ پرسنلٹی" ہے۔ جہاں تک اس کے ایڈریس اور لباس کا تعلق تھا یہ دونوں بہت شاندار تھے۔

لیکن گھر پہنچتے ہی وہ اپنے گلوز کے ساتھ کالج کی ڈمپل کو بھی اتار کر الماری میں رکھ دیتی جو سنک اور بل ایئر کی باتیں کرتی تھیں۔ جو لاہور میں فیشن کا سمبل سمجھی جاتی تھی اور

جس سے لڑکے اس لئے بات نہیں کرتے تھے کہ اس کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو نہایت کمتر اور ذلیل سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ٹیپ ٹاپ کو چمک بخشنے میں وہ تعلیم بھی بہت کام آئی جو اس نے پورے پانچ سال کونونٹ میں حاصل کی تھی۔۔ اس کا انگریزی کا تلفظ بے داغ اور انگریزی بولنے کی استعداد بے پایاں تھی۔۔

ڈمپل گھر میں سیدھی سادھی شکیلہ تھی۔ چابیوں کا گچھا اٹھاتے چھوٹے چھوٹے نقصانات کا گہرا جائزہ لیتی ہوئی منی۔۔ اسے اپنے باپ کی مشکلات کا پورا احساس تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ برانڈرتھ روڈ کی دوکان سے اتنی آمدن کبھی نہیں ہو سکتی کہ تین بہنوں کے جہیز بن سکیں۔۔ اور سامنے کی لان میں شامیانے اور بجلیاں فٹ ہو سکیں اور دولہا لمبی کار میں آسکے۔۔ ان باتوں کے احساس نے اس کے اندر ایک عجیب قسم کی قلندری پیدا کر دی تھی۔۔ جو ہو سو ہو قسم کی بے پرواہی۔۔۔ وہ کالج والی ڈمپل بنکر بھی بے پروا رہتی اور گھر کی منی ہو کر بھی ایک طرح کی شانِ استغنا برتتی۔۔۔ یہی اس کا سب سے بڑا حسن بھی تھا۔

ایک روز ارشاد ہوا:

کہ راجپور میں ایک امیر کے مکان پر کوئی کیمیاگر آئے۔ وہ انہیں فقیر سمجھ کر اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ چھ مہینے خوب جی توڑ کر خدمت کی۔ دریں اثنا فقیر نے جانے کا قصد کیا۔ پہلے تو امیر رضامند نہ ہوا۔ بارے اجازت دی تو فقیر بولا۔۔ کہ ہم کو ایک اکسیر یاد ہے تو نے جیسی ہماری خدمت کی ہے۔ اس کا نعم البدل تو ہو نہیں سکتا لیکن

اگر چاہو تو وہ سکھا دوں۔ امیر بولا۔۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھ کو چاہ نہیں۔ پھر اسی کیمیاگر نے کہا خیر تم کیمیا نہیں سیکھتے نہ سہی۔ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی ایک چیز چالیس دن کھاؤ۔ امیر اس بات پر رضامند ہوا۔ یہ انہیں چالیس دن تک حسب وعدہ کھلا کر رخصت ہوا۔۔۔ جاتے ہوئے کہنے لگا۔ دیکھو! ہم نے تمہیں اکسیر بنا دیا ہے۔

اتفاقاتِ زمانہ کے ہاتھوں امیر پر بُرے دن آئے۔ یہاں تک محتاج ہوا کہ سب ساز و سامان بک گیا۔ اصطبل میں گھوڑے نہ رہے۔ تھانوں سے بندھی گائے بھینسیں فروخت ہو گئیں۔ چپہ چپہ زمین رہن ہوئی۔ حویلی، محل و منزلے سب اسی راہ گئے جدھر آرائش کا سامان گیا تھا۔ استعمال کے چند برتن، ایک دو جوڑے کاڑھے کے بوری میں بند کر کے شہر سے باہر جا کر رہنے لگا۔۔ کہ اکابرین شہر کی طعن آمیز نظروں سے بچ رہے۔

ایک روز اپنے حال پر کفِ افسوس ملتا درخت تلے بیٹھا تھا کہ دل میں خیال آیا اس فقیر نے کہا تھا کہ ہم تم کو اکسیر بنا چکے ہیں۔۔ فوراً اپنا پسینہ ایک کانسی کی پتیلی پر مل دیا۔ وہ پتیلی کندن ہو گئی۔۔۔

رشیدہ نے جو وقفہ ڈمپل کے گھر گذارا تو گویا اسے ڈمپل اکسیر بناتی رہی۔۔۔ اتنے تھوڑے عرصے میں اپنی مکمل جون بدل لینا نہ تو رشیدہ کے اختیارات کی بات تھی نہ ڈمپل کے استعداد کی۔۔ یہ تو سیدھی سادی کیمیاگری تھی اور اس کا نسخہ لاہور میں ڈمپل سے بہتر کسی کو نہ آتا تھا۔

میں نے پلٹ کر اس کا سر ہاتھوں میں لے لیا . . . تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

کمرے میں زرد آہیں دھند کی طرح چھا گئیں۔

"ہے . . . . بہت ہے اسی لیے تو میں اس اعتبار کو آزما نہیں سکتی . . . میں . . . اپنی محبت کو، تمہاری محبت کو آزمائش کی کٹھالی میں ڈال نہیں سکتی۔ غازی! کچھ تو ایسا بھی میرے پاس رہنے دو جو ٹوٹا ہوا نہ ہو۔"

"وہ چلی گئی پھر . . ."

"کلا پھٹ جانے سے پہلے وہ مجھے ملنے کالج آئی تھی . . . پہلی اور آخری بار ہم دیر تک بنچ پر بیٹھے رہے۔ ہمارے دل پتھریلی بنچ کی سطح سے بھی ٹھنڈے تھے، جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ غازی! بی بی کی طرف بھی تو دیکھو . . . . وہ طیر کوٹلے چلی گئی تھیں۔ شادی کر کے وہاں ان کے تین بیٹے ہوئے . . . . اور پھر وہ تینوں بیٹے اشراف کے ہو گئے اور بی بی طوائف رہ گئیں۔ چھڑی طوائف . . . . سات سال پیا ہتارہ کر بازار میں لوٹ آئیں بی بی! جن سے ہم نفرت کرتے ہیں ان کے ساتھ سونے کی ہمیں کبھی معافی نہیں ملتی۔ کبھی معافی نہیں ملتی۔ کبھی معافی نہیں ملتی . . ."

ظفر نے لمبا سا زرد دھواں چھوڑ دیا۔

"جب سات سال کی شادی شدہ زندگی گذارنے کے بعد . . . تین بیٹے جننے کے بعد میں بازار میں آؤں گی . . . تو کم از کم مجھے ایک سکون ضرور ہو گا غازی!

.... کیسا سکون؟ میں نے پوچھا۔ وہ یہ سکون یہ ہے کہ میں تمہاری بیوی نہیں تھی، تم نے مجھے گھر سے نہیں نکالا... تم نے بیوفائی نہیں کی... میں نے آخری بار اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا... گلنار اب بھی وقت ہے اپنے ارادے سے باز آجاؤ..... خدا کے لئے کلا پھٹ نہ جاؤ... صاحب خان کی محبت سے میرا جذبہ زیادہ دیرپا ہوگا..... وہ چپکے سے اٹھ کر برقع کی ڈوریں باندھنے لگی... پھر بڑی دیر بعد بولی.... دعا کرنا میں واپس نہ لوٹوں۔ صاحب خان مجھے اپنے گھر میں اپنی پہلی بیوی کے قدموں میں بٹھائے رکھے...."

"صاحب خان کی پہلی بیوی کوئی اور.... ہے؟..."

"غیر ضروری باتیں نہ کرو.... مجھے یاد کرنے دو.. ایک ایک لمحہ ایک ایک لفظ اس سے بچھڑنے کا ایک ایک ثانیہ... وہ کتنی دبلی ہو گئی تھی... جیسے ٹائیفائڈ کے مرض سے اٹھی ہو.. بغیر لپ سٹک کے ہونٹ.... بغیر سرمہ کے آنکھیں.... چلتے ہوئے اس نے پھر مجھ سے کہا۔ غازی! تمہیں معلوم ہے نا میں تمہیں دغا نہیں دے رہی... میں نے سر جھکا لیا... میں تم سے بے وفائی نہیں کر رہی..... صاحب خان اگر مجھے چھوڑ دے گا... تو... میں برداشت کر لوں گی..... لیکن اگر... اگر شادی کے بعد تم نے مجھے چھوڑ دیا تو... تو غازی!... کچھ تو ایسا میرے پاس رہنے دو جو ٹوٹا ہوا نہ ہو...."

"چلی گئی.... گلنار.... بالآخر...."

غازی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے سرسوں رنگ چہرے سے کافور کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

موصل کہ یہ شہر نہایت قدیم اور دریائے دجلہ پر واقع ہے اور بغداد سے جو دارالسلطنت خلفائے عباسیہ تھا دکھن کی جانب تھوڑی مسافت پر ہے۔ یہاں ایک تاجر رومی مع زن و فرزند بقصدِ تجارت و زیارت خانہ کعبہ اپنے شہر سے روانہ ہوا جب موصل میں پہنچا تو ایک مردِ پیر سے جو عالم بے بدل اور زاہد بے مثل مشہور تھا ملاقی ہوا۔ جس کی صورت سے پرہیزگاری ظاہر تھی۔ سرخ چہرہ مانند زعفران کے زرد لب پر آہ زبان پہ فغاں، ہر طرح اثبات در دھا۔ زہد و تقویٰ اس درجہ کو تھا کہ بر صیصا اس کے آگے گرد تھا طاعت میں یکتائے عصر تھا۔ عبادت ظاہری میں وحید دہر تھا۔ علوم دنیا میں دستگاہ کامل تھی۔ الٰہیات و دینیات میں تحصیل حاصل تھی۔ معنی و منطق کو مثل ابجد پڑھاتا۔ حکمت افلاطون کو بھی اگر ملتا سکھاتا۔ بو علی سینا بھی خود اپنی حقیقت کو اس سے چھپاتا۔ اور کبھی قانون اس کے سامنے پیش نہ کرتا۔ تاجرِ رومی ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہا۔ دل و جان سے اس کا معتقد ہو گیا۔

اتفاقاً دردِ گردہ تاجر کو عارض ہوا۔ امیدِ زندگی سے مایوس ہو کر سخت گھبرایا کہ اس غربت میں جہاں کوئی یار و مددگار، مونس و غم خوار نہیں۔ اپنے اہل و عیال کو کس کے سپرد کر کے بنا بر حفاظتِ مال و دولت کے وصی مقرر کرے۔ اس اندیشے میں خیالِ خام بوجہ عقیدت تام یہ آیا کہ زاہد سے بہتر اس کام کے واسطے کوئی نہ ہوگا۔ مردِ خدا ہے

دنیا سے نافرد بے واسطہ ہے۔ اس واسطے زاہد کو بلایا اور حرفِ مطلب سنایا۔ اور عرض کی کہ جب میری روح تنِ خاکی سے مفارقت کرے۔ تجہیز و تکفین سے بہت سے زر و مال کو میرے شمار کیجے۔ اور چار حصے اوسکے فرما کے ہر ایک کو براہِ خدا، اہلِ احتیاج کو دیجئے۔ دوسرے کو آپ قبول فرمایئے۔ اور دو حصے باقیماندہ سے ایک حصہ صرف تعلیم میری اولاد کا کیجئے، اور چوتھے حصے کو محفوظ رکھیئے اور بلوغ پر ہر چہار لڑکوں پر تقسیم فرمایئے۔

جس شب کو تاجر نے ملکِ بقا کا راستہ لیا بعد تجہیز و تکفین زاہدِ خشک سال نے شمار مال و دولت کا کیا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اور زہد اس کا سانپ کی کینچلی بن کر جسم سے جھڑ گیا۔ اب دل میں ٹھانی کہ زنِ تاجر کو عقد میں لایئے۔ اور دخترِ تاجر کو اپنے فرزند سے منسوب کیجے۔ اور لڑکوں کو جن سے کسی طرح کا مفر نہیں اگلی منزل میں ٹھکانے لگایئے۔

موصل کے زاہد نے کیونکر دولت ہتھیالی اور اس دولت کو ہتھیانے کے بعد وہ کس طرح موصل کے قاضی کے پاس پہنچا یہ ایک مختلف داستان ہے۔

جس وقت رشتو جان ملک صاحب کے ساتھ جائنٹ اکاؤنٹ کھول کر بنک کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل جائنٹ اکاؤنٹ کیا ہوتا ہے؟ وہ تو ابھی نہ جانتی تھی کہ اس جائنٹ اکاؤنٹ میں ملک صاحب نے کتنی رقم جمع کی ہے! اسے تو بس اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کے پرس میں پچیس چیکوں والی ایک چیک

ک ہے۔ اب تک اس نے منی آرڈروں پر دستخط کئے تھے۔ آج بنک کے مینجر نے اس سے جابجا دستخط کروائے تھے۔ ان دستخطوں کو کرتے وقت اس کے جی میں انجانی سی خوشی تھی۔

ملک صاحب کتنے اچھے ہیں!

ملک صاحب اپنے بیٹے کی خاطر مجھ سے کتنی مروّت برتتے ہیں!

ملک صاحب تو ابّا جی ہی کا دوسرا روپ ہیں!

بنک کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ملک صاحب نے پہلی بار کہا۔

"میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار روپیہ جمع کروا دیا ہے۔"

"پانچ ہزار؟"

اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

"یہ ... یہ رقم آپ کی نہیں فقط آپ کے تصرف میں ہے۔"

"جی میں سمجھی نہیں ..."

"دیکھئے رشو! بات صرف اتنی ہے کہ میں نے یہ اکاؤنٹ محض اس لئے کھلوایا ہے کہ وقت بے وقت بہاولپور سے رقم نہیں پہنچ سکتی۔ آپ کو اپنا تمام تر وقت پڑھائی پر صرف کرنا چاہیئے۔ آپ کو یہ فکر نہیں ہونا چاہیئے کہ ... کہ ... روپے کہاں سے آتے ہیں؟ فیس کہاں سے دی جائے گی؟ آپ کو تو ... فقط اپنے مطالعہ سے غرض رکھنی چاہیئے۔"

"جی وہ تو میں . . . . میں باقاعدگی سے پڑھتی ہوں . . ."

"پڑھائی تو آپ یقیناً کرتی ہیں۔ لیکن میرا مطلب ہے کہ آپ گھر سے دور ہیں۔ یہاں ایک دوست کے ہاں آپ کا قیام ہے۔"

"ڈمپل بہت اچھی ہے جی . . ."

اچھی یا بری کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ . . آپ کو ان کا احسان اس قدر نہ اٹھا لینا چاہیے کہ . . . . بعد میں وہ آپ پر کسی قسم کی دھونس جما سکیں . . ."

"میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں جی . . ."

"میرا مطلب ہے کہ آپ کو وہاں ایک پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہنا چاہیے لاہور ایک مصروف شہر ہے، مہنگا شہر ہے۔ یہاں کوئی کسی کے اخراجات برداشت کر کے خوش نہیں رہ سکتا . . ."

"ڈمپل . . . ڈمپل ایسی نہیں ہے۔" رشو نے لب کاٹ کر کہا۔

"ڈمپل زیر بحث نہیں ہے رشو! میرا مطلب ہے کہ آپ آسانی سے ان کی مدد کر سکتی ہیں۔ اس رقم میں سے . . . . اور جب آپ ان کی مدد کرنے کی اہل ہیں تو پھر مفت ان کے گھر رہنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں ماہ بماہ ڈمپل کو کچھ . . . ."

"ہاں کیوں نہیں تین سو چار سو . . . . جس قدر بھی آپ چاہیں۔ آخر امتحانوں میں دیر ہی کونسی ہے؟ . . . . چند ماہ کی تو بات ہے۔"

تیرہ چار سو روپیہ ماہوار !

اسے تو کل سوا سو روپیہ اماں بھیجتی تھیں بہاولپور سے۔ ایکبار تو جٹ طیارے کی سی تیزی سے ساری زمین اس کے پیروں تلے سے نکل گئی۔ پھر خیال آیا جو کہیں ملک صاحب سے پہلے ملاقات ہو جاتی تو میں خالہ کے گھر سے کیوں نکلتی؟ خالہ جان کو تین چار سو روپیہ ماہوار دیتی اور دھونس سے رہتی۔ ڈمپل کے گھر میں اسے کوئی تکلیف نہ تھی لیکن پچھلے کچھ دنوں سے وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ڈمپل کے ابا جی اسے کھردری نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔ جب کبھی وہ اکٹھا کھانا کھاتے، تو ان کی نظریں رشو کی پلیٹ پر جمی رہتیں۔ جتنی مرتبہ وہ سالن کے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔ اتنی مرتبہ اس کے ابا جی ہولے سے کھانستے۔ جب وہ چھابے میں سے روٹی اٹھاتی ابا جی کا اپنا نوالہ جہاں بھی ہوتا لمحہ بھر کے لئے رک جاتا۔

رشو جان کو ڈمپل کے گھر رہ کر بہاولپور کی حویلی کا سا آرام ملا تھا لیکن ملک صاحب کے ساتھ جائنٹ اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد رشو کی انا بہت اونچی ہو چکی تھی... ایک معزز شہری کی طرح وہ اپنی ساکھ کے لئے یکدم بہت متفکر ہو گئی تھی...

"آپ کیا سوچ رہی ہیں رشو؟"

"کچھ نہیں جی..."

"پھر بھی؟"

"یہی سوچ رہی تھی جی کہ... کہ... آپ ٹھیک کہتے ہیں"

"دیکھو ناں رشّو! تمہاری ان سے کوئی رشتہ داری تو ہے نہیں۔ وہ منہ سے کہیں یا نہ کہیں لیکن بوجھ ضرور محسوس کرتے ہوں گے تمہارا۔ ویسے لاہور میں تو رشتہ دار چھوڑ اپنے بچّوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔"

اپنے بچّوں کا بوجھ؟ رشّو نے سر جھکا کر سوچا ... "ہائے اللہ! کیسا شہر ہے؟ جہاں اپنے بچّوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔"

سیاہ کار میسن روڈ کی طرف جا رہی تھی ... رشّو کے پرس میں پچیس چیکوں والی چیک بک تھی جس کے ہر چیک کو وہ اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کر سکتی تھی۔ ملک صاحب نے سگریٹ بجھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اچانک ان کا ہاتھ رشّو کے گھٹنے سے مَس کر گیا۔ پھر انہوں نے بڑی ندامت سے معافی مانگی تو رشّو نے فراخدلی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جی کوئی بات نہیں۔"

افسوس ملک صاحب کے کندھے پر کوئی ہاتھ نہ تھا ورنہ وہ ضرور رشّو کے ہاتھ کو تھپکتا!

اتنے سارے تحفے جو ملک صاحب وقتاً فوقتاً اس کے لئے لاتے رہے تھے انہوں رشّو کو احسان مند ضرور کیا تھا۔ لیکن وہ اسے ملک صاحب کے قریب لانے سے قاصر رہے تھے۔ وہ انہیں ظفر کا باپ سمجھتی تھی۔ اور بطور بہو بیگم کے ان کی سعادت مندی اور فرمانبرداری کرتی تھی۔ بنک میں اکاؤنٹ

کھلوانے کے بعد بنک سے گھر تک پہنچتے ہوئے پہلی بار اس نے ملک صاحب کے وجود پر بھرپور نظر ڈالی۔ ۔ ۔ ۔ ان کے اثاثے کا اندازہ لگایا۔ ان آسائشوں کا پڑتا لگایا جو ان کے ساتھ مستقل طور پر رہنے میں حاصل ہو سکتی تھیں۔ پھر جی ہی جی میں وہ ان کے معمر وجود، دراز قد قائداعظم جیسی شخصیت سے متاثر ہوئی پہلی بار اس نے دل ہی دل میں باپ بیٹے کا موازنہ اس طرح کیا جیسے گنگا اور سندھ کے میدان کا مقابلہ جغرافیے کی کلاس میں کیا جاتا ہے۔

اس تجزیے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ جب کار کا دروازہ پکڑ کر ملک صاحب نے اسے اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو رشو مزاحم نہ ہوئی بلکہ سفید دستانے میں ملفوف ہاتھ ملک صاحب کے پھرتیلے ہاتھ میں تھما دیا۔

دونوں ہاتھوں میں ننھی سی غلط فہمی، چھوٹا سا معاہدہ۔ ذرا سا احساس رفاقت پیدا ہوا جو ملک صاحب کے لئے بڑی گہری تسکین کا باعث ہوا۔ اور جس نے رشو کو پہلے متحیر کیا اور بعد میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"میں کل آؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ شام کو۔ ۔ ۔"

"جی۔"

"تب تک۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ۔ ۔"

"جی۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ۔ ۔ ۔"

کہاں وہ تو ڈسپل کے آباجی رشو کے نوالے گنتے تھے اور کہاں تین سو

روپیہ ملتے ہی رشّو کے لئے ناشتہ پر انڈے پراٹھے پکنے لگے۔ اوپر والے حصّے کا کل کرایہ ڈھائی سو روپے تھا۔ اس کرائے پر سارے گھر کی گذر بسر ہوتی تھی۔ ڈمپل اپنے اخراجات کی خود کفیل تھی۔ اور اس کے اخراجات اللہ خود پورے کرتا تھا پورے تین سو روپے ڈمپل کے ابّا کو کیا مل گئے، انہیں تو رشّو جان پوری شہزادی نظر آنے لگی۔

پہلے تو رشّو جان کو ان لوگوں کی خدمت گذاریوں پر تعجب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ان مراعات کی عادی ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ ہر جگہ اس بات کی متوقع رہنے لگی کہ لوگ اٹھ کر اسے پانی پلائیں۔ اس کے لئے کرسی لائیں، اس کا گرا ہوا رومال پکڑ دیں، بھاگ کر اس کے لئے ٹیکسی لائیں۔۔۔۔ خدمت کرنے سے زیادہ خدمت کروانے میں لطف ملنے لگا۔۔۔ زندگی میں ایک بانکپن پیدا ہو گیا خود اعتمادی کا جذبہ، خود ستائی کی خواہش، خود پسندی کی عادت رفتہ رفتہ جڑ پکڑنے لگی۔۔۔۔۔

کبھی تو ملک صاحب کی سیاہ گاڑی پھاٹک پر آ کر لگتی تھی تو گھر پر ابّا جی سوں سوں کرتے تھے۔ اب ملک صاحب کی گاڑی دیکھ کر گھر والے پذیرائی کو دوڑتے۔۔۔۔ ملک صاحب کو گھر کا خاص فرد سمجھ کر سونے والے کمرے میں بلا لیا جاتا۔۔۔ پاس کے کھوکھے سے کوکا کولا کی بوتلیں آتیں، لڑکیاں پڑھتی رہتیں اور ملک صاحب اور ڈمپل کے ابّا جی پاس بیٹھ کر شطرنج کھیلتے رہتے۔

سب کچھ کتنا معصوم تھا! کس قدر گھریلو پن تھا ساری فضا میں!.... صرف ایک ٹائم بم چھپا ہوا تھا اس مخملیں فضا میں.... اور یہ مخملیں ٹائم بم اس روز پھٹا، جس روز ڈمپل اوپر کرائے داروں سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ ابا جی برانڈرتھ روڈ سے نہ لوٹے تھے۔ اور ڈمپل کی چھوٹی بہنیں سکول کی گرل گائیڈز کے ساتھ کسی ریلی پر گئی ہوئی تھیں۔

رشو کو اس دن ہلکا سا زکام تھا۔ اور وہ کاپیاں کتابیں لئے نائیلون کا ہلکا گلابی نائٹ سوٹ پہنے بالوں سے کرلز لگائے پلنگ سے پشت لگائے بیٹھی تھی۔ ملک صاحب بغیر دستک دیئے داخل ہوئے تو غیر شعوری طور پر وہ اکھڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اس کی نگاہیں کمرے میں ادھر ادھر کسی دوپٹے کو تلاش کرنے لگیں۔ ملک صاحب نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر کرسی گھسیٹی، اور اس پر بیٹھ کر اپنا سر ہاتھوں میں لے لیا۔

رشو نے بستر کی چادر کو کندھوں تک اوپر کرتے ہوئے سلام کیا لیکن ملک صاحب نے اس سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔

"گھر والے کہاں ہیں...."

"ڈمپل کے ابا تو ابھی آئے نہیں اور ڈمپل اوپر گئی ہے مسز سید کے پاس۔"

"اور لڑکیاں۔"

"وہ بھی گھر پر نہیں ہیں.... گرل گائیڈ ریلی پر گئی ہیں والٹن...."

"شکر الحمد للہ!..." ملک صاحب نے لمبی سانس لی۔ اور پھر کرسی کی پشت رشّو کی جانب کر کے بولے۔

"جو کچھ اب میں تم سے کہنے والا ہوں اس کا جواب چاہے تم کچھ بھی دو... لیکن جب تک میں بات کروں درمیان میں مت بولنا..."

رشّو نے مری سی آواز میں جی کہا۔

ملک صاحب کی پیٹھ رشّو کی طرف تھی۔ گردن سے سر تک جاتے ہوئے بالوں میں سیاہی سے زیادہ سفیدی تھی۔ لیکن کمر مضبوط اور سیدھی تھی۔ کانوں کے پیچھے ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ لیکن لوتیں بہت سرخ اور تازہ تھیں۔ رشّو نے ملک صاحب کی گردن پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ اور چپکے سے سننے میں مشغول ہو گئی... وہ جانتی تھی کہ اب اس لمحے... اسے کوئی بہت اہم فیصلہ کرنا ہو گا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن یہ جسارت اس لئے ہے کہ میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ تم دراصل ظفر کی امانت نہیں ہو۔ اگر تمہیں ظفر سے محبت ہوتی۔ اگر تمہیں ظفر میں تھوڑی سی بھی دلچسپی ہوتی تو تم کبھی اس کے خط لے کر مجھ تک نہ پہنچتیں۔ دراصل تم نے ایک طرح مجھ سے ظفر کے خلاف پناہ مانگی تھی۔ ظفر کی محبت چونکہ یک طرفہ تھی اس لئے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ... کہ اگر میں تم سے اظہار محبت کروں تو یہ ظفر

کی حق تلفی نہیں ہے۔ ظفر تمہاری زندگی کا ساتھی نہیں ... فقط ایک ایسی ٹوٹی ہوئی دیوار ہے جو ہمیشہ ہمسایوں کے درمیان وجہ نزاع ہوا کرتی ہے۔"

ملک صاحب بولتے جا رہے تھے۔ جسقدر علم کا خزینہ ان کے پاس موجود تھا استعمال میں لا رہے تھے۔ منطق کا جو بھی اسلحہ ان کے پاس برسوں سے سنوڑ تھا داغ رہے تھے۔

اور رشو جان آہستہ آہستہ سوچ رہی تھی ...

اتنی جلدی ... یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟

ابھی کل کی تو بات ہے کہ میں بہاولپور سے آئی تھی ... فقط فقط ایز اور شکستہ ایز کے لفظ کا ہیر پھیر ہے۔ اور اتنی بڑی بات بھی ہو گئی ...

کیا مجھے ظفر سے محبت تھی؟

کیا ظفر سے محبت اب ان حالات میں پنپ سکتی ہے؟

کیا ملک صاحب اب مجھے اپنی بہو بنانے پر رضامند ہو جائیں گے؟

اور ملک صاحب کہہ رہے تھے۔

"ظفر کے پاس آپ کو دینے کے لئے جوانی ہے۔ جذبہ ہے۔ لیکن جوانی کا جذبہ کچھ ایسی چیز نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ ظفر کی طبیعت میں طغیانی کی سی کیفیت ہے۔ جب یہ کیفیت جاتی رہتی ہے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ میں ظفر کا باپ ہوں مجھے اس سے کوئی بیر نہیں۔ اگر جو کہیں آپ کو بھی اس میں دلچسپی

ہوتی تو میں ... میں اپنے منہ پر ہمیشہ کے لئے تالا ڈال لیتا لیکن ... میں جانتا ہوں کہ ... آپ کو اس سے محبت نہیں اس لئے ... مجھے ... میرا فرض ہے کہ میں آپ سے ظفر کی کوتاہیوں کا ذکر کروں! ..."

ظفر کی کوتاہیاں؟

ظفر کی تو فقط ایک ہی کوتاہی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اب جب کہ کالج کی تمام لڑکیوں نے اس سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ اب بھی ظفر کی نگاہیں اس کی آمد پر اسے خوش آمدید کہنے کو اٹھتی تھیں۔ اور کلاس کے ختم ہونے پر گلے ملنے کو ساتھ ساتھ چلتی تھیں ... ظفر میں تو بس ایک ہی کمی تھی کہ ... کہ ...

"رشو ... ! میں بچوں کا باپ ہوں۔ جوان لڑکوں کا باپ ہوں۔ میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ لیکن بخدا میری عمر صرف پچاس برس ہے۔ میری بیوی میری بیوی نہیں اپنے بچوں کی ماں ہے۔ ہمارے درمیان نہ محبت کا رشتہ باقی ہے نہ جنس کا ... رشو! ... رشو! مجھ پر رحم کرو ... مجھ پر رحم کرو رشو!"

یکدم ملک صاحب کرسی سے اٹھ کر پلنگ کے پاس دو زانو ہو گئے، پھر انہوں نے رشو کے پلنگ کی پٹی پر بازو رکھ کر اپنا سر اس پر دھر دیا۔ اور ان کی سسکیوں سے رشو کا پلنگ بجلی کی لہروں سے بھر گیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں ملک صاحب؟"

سسکیاں اور بلند ہو گئیں۔

"ملک صاحب . . . . آپ . . . ."

"میں زندگی سے، تنہائی سے تنگ آچکا ہوں۔ میں روپیہ کمانے والی مشین بن چکا ہوں جسے ہنسنے کا جسے خوش رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں، میری اپنی زندگی پارے کا وہ چھینٹا ہے جو فرش پر گرتے ہی ننھی ننھی مدوّر گولیوں میں بٹ جاتا ہے۔ میں . . میں کہیں موجود نہیں . . کہیں نہیں . . . . صرف میرے بچے موجود ہیں، میرا گھرانہ موجود ہے۔ تم مجھے ثابت کر سکتی ہو رشّو . . . . تم ان ننھے قطروں کو جمع کر کے پھر میرا وجود تیار کر سکتی ہو . . . . اور اگر تم نے انکار کر دیا تو . . . ."

اسکیمیاں اب اس قدر بلند ہو چکی تھیں کہ رشّو کو آگے بڑھ کر ملک صاحب کا سر اٹھانا پڑا۔ تشفّی کا کوئی لفظ ابھی اس کے منہ سے نہ نکلا تھا کہ ملک صاحب نے اپنا سر اس کے زانو پر رکھ دیا۔ ننھے ننھے گرم آنسو نائیلون سے رِس کر اس کی پنڈلیوں پر گرنے لگے . . . .

ملک صاحب کے ساتھ رشّو کا نکاح ایک چھوٹی سی تقریب تھی . . . رشّو کی طرف سے ڈمپل کے ابّا جی ولی مقرر ہوئے۔ ملک صاحب نے پچاس ہزار روپیہ کا حق مہر اسی وقت رشّو کو ادا کر کے نکاح پڑھوایا . . . . بالکل بندر بندریا کا سا ننگا بوچا نکاح . . . . . رشّو کے ہاتھوں میں ڈمپل نے کیوٹیکس لگائی۔ اسے زرق برق سرخ جوڑا پہنایا . . . . اور اسی میسن روڈ کے ایک کمرے میں دولہن کو دولہا کے سپرد کر دیا . . . .